محمد الیاس

اسکالر پی ایچ۔ڈی اردو، اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

پروفیسر ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی

صدرِ شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

بیگانگی کا نو آبادیاتی سیاق اور راشد کی نظم گوئی

Muhammad Ilyas
Scholar Ph.D Urdu, BZU Multan.
Prof. Dr. Mumtaz Khan Kalyani
Chairman, Dept of Urdu, BZU Multan

Post Colonial Perspective of Alienation and Rashid's Poem

Colonizers alienate the colonized through their behavior, concepts and doings. The natives start disowning their own land in that the estrangement they receive from the foreign masters. Alienation is a prominent concern of both the layman and the creative artist's works of the native writers and poets exhibit alienation a prominent term during and after the colonial period. The term enjoys a variety of interpretations which this research paper will discuss briefly. The poems of Noon Meem Rashid exhibit alienation in full glow. This paper analyses Noon Meem Rashid's poetry with the fame of alienation. The paper explores how the poet feels estrangement from everything he owned as a native. Rejection, unrest, hopelessness and loneliness are some of the thematic variants the research paper is going to explore.

Key Words: *Colonizers, Alienation, Natives, Post Colonial, Context, N. M. Rashid, Verse.*

نیا انسان جن مسائل کا شکار ہوا ہے اُن میں سے ایک بیگانگی / مغائرت بھی ہے جو اس کے "مقسوم" میں "لکھ" دی گئی ہے اور اس کی تعبیر و توضیح کو متنوع تناظر میں دیکھا گیا ہے: مارکسی، وجودیاتی اور نو آبادیاتی وغیرہم۔ مارکسی بیگانگی میں محنت کش اپنی محنت کا صلہ حاصل نہ کرنے کی صورت میں اپنی محنت، اپنی "پیدا" کی ہوئی چیز، دوسرے انسانوں اور زندگی کی متنوع جہات سے یکسر بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وجودیاتی بیگانگی میں انسان اپنے وجود سے اس طور بیگانہ ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے افراد کے ساتھ اپنے تعلقات اور انسلاکات سے بے شناخت

ہو کر اسے بر قرار نہیں رکھ پاتا، جبکہ نو آبادیاتی بیگانگی میں مقامی باشندے کو اُس کے ماضی، اُس کی ثقافت اور اُس کے متون سے اجنبی کر کے اُسے بیگانہ کر دیا جاتا ہے۔

نو آبادیاتی خطے میں مقامی باشندہ کسی نئی سیاسی شناخت کا نہیں بلکہ قدیمی سیاسی شناخت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ استعماری یلغار کی بدولت مسلسل اور پیچیدہ نفسیاتی مراحل سے گزرتا ہے اور جس کے اثرات نو آبادیاتی باشندے کی شخصیت پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ اُسے نو آبادیاتی جبر کے نتیجے میں اپنے ماضی سے کٹ کر ایک مخصوص "حال" میں رہنا پڑتا ہے۔ اُسے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اُس کا "سیاسی ماضی" ظالمانہ اور اُس کا "ثقافتی ماضی" زوال پذیری میں لپٹا ہوا تھا جسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے وہ اُس کا "حال" روشن خیالی، اصلاح، پیش رفت، ترقی، نئے تعلیمی نظامات اور آئینی اداروں سے مزین کیا جاتا ہے۔ یہی "چکا چوند" مقامی باشندے کے دل میں نو آباد کاروں کے لیے ترحم کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ نتیجتاً وہ اپنے ماضی سے بیگانہ ہو کر "حال" میں سانس لیتا ہے۔

نو آبادیاتی بیگانگی میں نہ صرف پورے معاشرے کو استعمار زدہ کیا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مقامی ذہن کو بھی اس عمل سے گزارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کہتے ہیں:

> "نو آبادیاتی بیگانگی، معاشرے اور ذہن کے استعمار زدہ کیے جانے کے مجموعی عمل کی پیداوار ہے۔ یہ لسانی، ثقافتی، تاریخی اور وجودیاتی سطح پر تجربہ کی جاتی ہے۔ اس لیے یہ زیادہ پیچیدہ اور متنوع طور پر تہ دار بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ نو آبادیاتی باشندے اپنی زبان سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ اوّل، اُن کی مقامی زبانوں کو نو آبادیاتی انتظامی، معاشی، تعلیمی نظام میں اہم کردار ادا کرنے سے محروم رکھا جاتا ہے ایک ایسی پالیسی جس کا مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی تسلسل جاری ہے۔ پھر وہ یقین قائم کرتے ہیں کہ مرکزی زبان صرف انگریزی (ہے اور وہی) اس قابل ہے کہ حال یا نو آبادیاتی جدیدیت کے پیچیدہ تجربے کو سمجھ سکے یا اس کا اظہار کر سکے۔"(۱)

ڈاکٹر نیر نے بیگانگی کے نو آبادیاتی سیاق کے حوالے سے بہت سی اہم باتیں کی ہیں کہ نو آباد کاروں کی تہہ در تہہ پالیسیوں کی بدولت مقامی باشندہ اپنی زبان سے اس طور بیگانہ ہو جاتا ہے کہ وہ اسے حقیر اور کم تر دکھائی دیتی ہے اور اس کے مطابق انگریزی ہی ایک ایسی زبان ہے جو نو آبادیاتی ذہن اور اس کی پیچیدہ کار فرمائیوں کو بخوبی سمجھ سکے۔

اس سیاق میں دیکھا جائے تو راشد کا تشکیلی دور سامراج کے استبداد کا دور ہے جس کی عکاسی راشد کی شاعری میں بھرپور نظر آتی ہے۔ اُس وقت استبدادیت کی بدولت فرد تنہائی اور افسردگی کا شکار ہو چکا تھا۔ سماجی اقدار کی شکست وریخت سے انسان کے مزاج میں منتشر خیالی جنم لے رہی تھی۔ "متن" سے دور "حاشیے" پر بیٹھا مقامی باشندہ نو آبادیاتی نظام کی تباہ کاریاں کھلی آنکھوں دیکھ رہا تھا۔ اس صورتِ حال میں راشد نے اپنے عہد کی ترجمانی کی، جس میں جدید انسان آزادی کا طالب تھا۔ "ماورا" میں اس تناظر کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی کہتے ہیں:

"راشد کی شاعری ہندوستان میں سیاسی آزادی کی جدوجہد اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران پروان چڑھی۔ وہ زندگی کے ایک نئے زاویہ نظر کے ساتھ شاعری میں داخل ہوئے۔ یہ زاویہ نظر ایک ایسے معاشرے کی آرزومندی سے عبارت ہے کہ جس میں فرد مکمل طور پر آزاد ہو۔ اس "عینی کائنات" کی گونج "ماورا" (پہلا شعری مجموعہ) میں بھی ہے جس کا بیش تر حصہ اسی دور کی سیاسی جدوجہد اور عام معاشرتی صورت حال میں فرد کی ذہنی اور جذباتی کش مکش سے عبارت ہے۔ راشد کی ابتدائی شاعری ۱۹۳۵ء کی نوجوان نسل کے ذریعہ ذہنی بغاوت کی کامیاب نمائندگی کرتی ہے۔"(۲)

راشد ملازمت کے دورانیے میں اپنے تہذیبی ماحول سے دور رہے۔ اس دوری اور فاصلے نے اُن پر تخلیقی سطح پر اجنبیت طاری کی۔ اس کی متعدد تصویریں اُن کی نظموں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہےں۔ بالخصوص "ابولہب کی شادی" جیسی نظم میں یہی کیفیت نظر آتی ہے کہ ابولہب کا اپنے وطن سے دور جانا اور پھر واپس لوٹنا اور پھر دوبارہ واپس چلے جانا بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے اور اس کا اطلاق راشد کی نجی زندگی پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے ایک مصاحبے میں راشد سے سوال کرتے ہوئے پوچھا تھا:

"اپنی زمین سے آپ کی ایلیا نیشن کی جھلکیاں آپ کی کئی نظموں میں موجود ہیں۔ مثلاً "ابولہب کی شادی" ابولہب کا اپنے وطن کی جانب پلٹنا اور پھر یہاں سے مفرور ہو جانا۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ کا رابطہ اپنے وطن سے منقطع ہو چکا ہے؟"(۳)

سعادت سعید کے متذکرہ بالا سوال کو دیکھتے ہوئے ایک اور سوال ذہن میں جنم لیتا ہے کہ راشد سے سوال کرتے ہوئے انھوں نے ایلی نیشن (بیگانگی) کا احاطہ کرنے کے لیے "ابولہب کی شادی" جیسی نظم ہی کیوں

منتخب کی؟ شاید اس میں انھوں نے راشد اور اُن کی تخلیقی کردار میں کسی حد تک مماثلت تلاش کی ہو۔ سعادت سعید کے سوال کا جواب راشد نے ان الفاظ میں دیا تھا:

"جیسا کہ آپ نے خود کہا کہ ابو الہب تو اپنے وطن کو پلٹتا ہے۔ اسے ایلیانیشن نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی شناخت پرانے حوالے سے نہ کی جائے۔ بلکہ نئے حوالے سے اسے پہچانا جائے۔ اس کا وطن سے باہر جانے یا وطن میں رہنے کے عمل سے کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص اپنے وطن میں رہتے ہوئے ایلیانیشن کے شکنجے میں جکڑا جاسکتا ہے اور دوسرا شخص وطن سے باہر رہتے ہوئے بھی ایلیانیشن سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا معاملہ ہے۔ اس میں مادی فاصلوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔"(۴)

راشد کی اس گفتگو سے ایک بات مترشح ہوتی ہے کہ ان کے ہاں بیگانگی کا تصور یک سر مختلف ہے۔ اُن کے مطابق نو آبادیاتی باشندہ اپنے وطن یں رہ کر بھی بیگانگی کے شکنجے میں جکڑا جاسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ملک سے باہر رہتے ہوئے اس قسم کے عذاب سے محفوظ رہے۔

نو آبادیاتی بیگانگی کے ضمن میں دیکھا جائے تو کلامِ راشد کا معتدبہ حصہ اس صورتِ حال کی عکاسی کرتا ہے۔ "ماورا" کی ابتدائی نظمیں اگرچہ عشق کے روایتی تصور کی پیکر ہیں لیکن اپنے اسلوب اور مواد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ یک سر روایتی تصور سے انحراف کرتی نظر آتی ہیں۔ مختلف چیزوں کو روایتی تصور سے دیکھنا شاید راشد کے مزاج کے مطابق نہیں اور نہ ہی اُن کی نظم اسے گوارا کر سکتی تھی۔ اس لیے راشد نے اسے غیر روایتی طور پر برتا۔

ایک سچا تخلیق کار اپنے سماج سے کنارہ کش نہیں رہ سکتا اور سماج اور سیاست میں ہونے والے تغیرات اُس کی تخلیق کا حصہ بنتے ہیں۔ وہ ان چیزوں سے موضوعات اور خیالات کشید کر کے اپنے تخلیقی سانچے میں ڈھالتا ہے۔ زندگی کے ساتھ جڑت ایک تخلیقی ذہن کو جلا بخشتی ہے۔ بعینہ راشد بھی اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات سے منہ نہیں موڑتا۔ راشد کی عالمی صورتِ حال اور بالخصوص ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال پر گہری نظر تھی۔ یہ وہ دور ہے جب ہندوستان پر استعماریت مسلط تھی اور آزادی کی تحریکیں آہستہ آہستہ رنگ لا رہی تھیں۔ صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہندوستان آزادی کے لیے پر تول رہا تھا۔ فرد کی آزادی کٹنے کے قریب تھی۔ وہ خود کہتے ہیں:

"جس زمانے میں مَیں نے پرورش پائی ہندوستان اجنبی حکومت کے پنجوں سے نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ شروع ہی سے میرے نزدیک اس آزادی کی جدوجہد کی غایت فرد کی آزادی تھی کیونکہ غلامی نے فرد کی اخلاقی اور نفسیاتی زندگی میں ایک خلا پیدا کر رکھا تھا۔ اور وہ خلا زشتی اور شر سے بھرنے لگا تھا۔ غلامی فرد کی قیمت اور قامت دونوں کو کم کر دیتی ہے۔ اس قسم کی زندگی میں عشق اور فکر دونوں کوتاہ اور کم مایہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرد کو اپنے نشوونما کے لیے جس داخلی اور خارجی ہم آہنگی کی ضرورت ہے، اسے غلامی درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔"(۵)

"ماورا" کی متعدد نظموں میں راشد کا نو آبادیاتی شعور نمایاں نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کی دوسری نظم "رخصت" میں بھی کچھ اشارے ملتے ہیں۔ اس نظم میں راشد ایک ایسے عاشق کے روپ میں نظر آتا ہے جو محبت کے لمحات سے بھی حظ یاب ہونا چاہتا ہے لیکن اُس کا "فرض" بھی اُس کو بلا رہا ہے۔ وہ اپنے فرض کی تکمیل کے لے رخصت کا طالب ہے۔ یہاں لفظ "فرض" کس چیز کی غمازی کر رہا ہے؟ اُس کے لے "غیر" کی ملازمت کرنا قابل قبول نہیں۔ وہ مجبوری کے باعث عدم دلچسپی اختیار کرتا ہے جس کی بدولت وہ بیگانگی کا شکار ہو کر اپنی اس "محنت" سے یک سر کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ ذیل کے مصرعوں میں شاعر کی "کم نصیبی" اور "سیہ بختی" ملاحظہ کیجیے (جو دراصل بیگانہ فرد کی کم نصیبی ہے) کہ وہ الم و یاس کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔

مجھ سا بھی کوئی ہو گا سیہ بخت جہاں میں
مجھ سا بھی کوئی ہو گا اسیر الم و یاس
مجبور ہوں، لاچار ہوں کچھ بس میں نہیں ہے
دامن کو مرے کھینچتا ہے "فرض" کا احساس
ہو جاؤں گا مَیں تیرے طرب زار سے رخصت
اس عیش کی دنیائے ضیابار سے رخصت
ہو جاؤں گا اک یادِ غم انگیز کو لے کر
اس خلد سے، اس مسکنِ انوار سے رخصت
تو ہو گی مگر بزمِ طرب باز نہ ہو گی

یہ ارضِ حسیں جلوہ گہِ راز نہ ہو گی		(کلیاتِ راشد، ص ۲۴)

تیسری دنیا کا مغائرت زدہ انسان جن مسائل سے دوچار ہے، یہ ایک الگ دردناک داستان ہے۔ خاک و خون میں غلطاں یہ انسان ایک طرف تو اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے اور دوسری طرف اپنے "آقاؤں" کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ راشد کا انسان ایک ایسی ہی دنیا کا باسی ہے جو اُس کی اپنی دنیا نہیں بلکہ "غیر" کی تخلیق کردہ دنیا ہے، اور غیر نے اس دنیا کی تخلیق ایک بھرپور نظام کے تحت کی ہے جو مجبوروں اور مقہوروں کی دنیا ہے، جس میں کھل کر سانس لینا بھی محال ہے۔ نو آبادکار جب کسی خطے پر اپنا تسلط قائم کرتے ہیں تو وہاں کے مقامی باشندوں کو اُس کے اپنے ہی دیس میں اجنبی بنا دیتے ہیں۔ مقامی باشندوں کو اپنی ہی چیزوں پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ وہ ہر دم اور ہر آن اپنے اوپر مرعوبیت طاری رکھتا ہے۔ اُس کا طرزِ عمل، اُس کا فکر و تدبر ہر ایک چیز پر "غیر" قابض ہوتا ہے اور یہ ساری چیزیں مل کر نو آبادیاتی بیگانگی کو جنم دیتی ہے۔

"ماورا" میں شامل راشد کی ایک نظم "انسان" جو سانیٹ فارم میں ہے، اس حوالے سے بھی ایک اہم نظم ہے کہ یہ راشد کی تخلیقی حسیت کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں راشد نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ غیر کی تخلیق کردہ دنیا کے دکھوں کا مداوا شاید خدا کے پاس بھی نہیں۔ یہاں پر راشد بیگانگی کی اس کیفیت تک پہنچے ہیں جسے مابعد الطبیعیاتی بیگانگی کہا جاسکتا ہے۔ راشد کے ہاں انسان کا تصور اُن کے دیگر مجموعات میں بھی زیادہ وسعت اور ہمہ گیریت کا حامل ہے۔ یہ راشد کی تشکیلی دور کی نظم اور انسان دوستی کی عمدہ مثال ہے:

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مُردوں کی، بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں!
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنالی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تُو نے
اور انسانوں سے لے لی جرات تدبیر بھی تُو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی!
اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں

میں اکثر چیخ اُٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساسِ بضاعت پر
ہماری بھی نہیں افسوس، جو چیزیں "ہماری" ہیں!
کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا!
خدا سے بھی علاجِ دردِ انسان ہو نہیں سکتا! (کلیاتِ راشد، ص ۲۴، ۲۵)

نو آبادیاتی نظام نے بیسویں صدی میں انتشار، خلفشار، کساد بازاری اور جنگ و جدل پر استوار ایسا معاشرہ تشکیل دیا جس کا کوئی واضح نصب العین نہیں تھا۔ ہر طرف مایوسی، اجنبیت، بیگانگی، بے یقینی اور بے سمتی عروج پر تھی۔ یہ اسی نظام کی "برکات" تھیں جس نے ایک نیا انسان متعارف کرایا۔ اس نئے انسان نے اگرچہ ماضی سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا لیکن اُس نے مستقبل کے لیے بھی کوئی واضح حکمت عملی اختیار نہ کی تھی۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز کو نہ سمجھ سکا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو استبداد کے اس دور کے فرد کی ذہنی حالت مزید فرد فرد ہو گئی، اور وہ انتشار کا شکار ہو گیا۔ اوپر کی نظم میں راشد نے ایسے انسان کی نوحہ گری کی ہے جو بے بس، مجبور و مقہور ہے۔ راشد جب نو آبادیاتی عہد میں مشرقی انسان کو ذلت کے قعرِ مذلت میں دیکھتا ہے تو اکثر چیخ اٹھتا ہے۔ بنی آدم کی ذلت مختلف نوعیتوں کی حامل ہے لیکن یہ ذلت مشرقی انسان کے لیے نو آبادیاتی نظام کی پیدا کردہ ہے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ یہ انسان نفسیاتی طور پر اتنا منتشر ہو گیا کہ اُس نے خود مغرب کو مشرق پر تسلط قائم کرنے کے لیے راہ ہموار کی اور اندرونی و بیرونی سازشوں کا شکار ہوا اور ناموافق حالات کی گتھی مزید الجھتی چلی گئی۔

راشد نے قیامِ ایران کے دوران مشاہدہ کیا کہ ایک مقامی باشندے کے لیے نو آبادیاتی بیگانگی کس طرح اذیت ناک ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہی معاشرے کی بد حالی کا نوحہ اور تماشا ملاحظہ کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شاہین مفتی کہتی ہیں:

> "راشد نے معاشرتی بدحالی کا کرب آمیز تماشا ہندوستان کے مخلوط مذاہب، زبانوں اور تہذیبوں میں دیکھا۔ اگرچہ ملازمت کے بعد شیشے کے گھر میں بیٹھ کر ایران کے قیام کے دوران میں یہ نظری اور فکری تماشا جو زرعی نظام کی غلامی، ریاستی نظام کے احساسِ کمتری اور انگریزی نظام کی مقامی شرمساری سے بندھا تھا۔ مشرق اور مغرب کی سیاسی اور تہذیبی کشمکش کا آئینہ دار تھا۔"[۶]

نو آبادیاتی باشندہ اس جبر یہ نظام سے اتنا بددل ہوتا ہے کہ وہ اُس کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے۔ یہ بغاوت بعض اوقات تو براہِ راست ہوتی ہے اور بسا اوقات کسی اور انداز سے! وہ براہِ راست بغاوت اُس وقت کرتا ہے جب وہ محرومی کا شکار ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ یہ بخوبی سمجھتا ہے کہ یہ محرومی اور احساسِ کمتری اُس کے بیرونی آقا کی دین ہے۔ اس محرومی کا ایک سبب نو آبادکاروں کے وہ مقامی دستِ راست بھی ہوتے ہیں جنھوں نے ہر مشکل گھڑی میں اُن کا ساتھ دیا اور تاریخ اُنھیں غدار کے لقب سے ملقب کرتی ہے۔ یہ غدار نو آبادیاتی باشندے کی محرومی کا سب سے بڑا سبب بھی بنتے ہیں۔

کلامِ راشد میں بغاوت کی دیگر سطوح کی مانند ایک سطح زندگی سے فرار بھی ہے اور زندگی سے یہ فرار نو آبادیاتی بیگانگی کی بدولت ہے۔ زندگی کی کٹھنائیوں اور الجھنوں کو اردو شاعری کی روایت میں مختلف انداز میں کثرت سے برتا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے حیاتِ انسانی کے دکھ و کرب کو کسی نہ کسی پیرائے میں بیان نہ کیا ہو۔ میر سے لے کر عہدِ حاضر کے تمام جدید حسیات کے شاعر کے ہاں اس کے آثار ملتے ہیں۔ کبھی تو زندگی کو طوفان سے تشبیہ دی گئی، کبھی زندگی جوئے شیر، تیشہ اور سنگِ گراں کہلائی؛ کبھی اسے حلقہ دامِ خیال قرار دیا گیا اور کبھی زندگی کو مفلس کی قبا کی مانند درد کے پیوند لگائے گئے۔ راشد بھی زندگی کو اپنے تخلیقی دھارے میں لے آئے۔ اُن کے ہاں زندگی بے اطمینانی، اضطراب اور فرار کا دوسرا نام ہے۔ کلامِ راشد میں متعدد جگہوں پر زندگی سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اس سے فرار ملتا ہے۔ زندگی سے یہ فرار راشد کے مزاج سے مطابقت پذیری کے باعث ہوا ہے جس سے بیگانگی عیاں نظر آتی ہے۔ یہ بیگانگی اور بیزاری اس جدید عہد کے انسان کا نوحہ ہے جس نے نو آبادیاتی عہد میں بیگانگی کا شکار ہو کر اپنے آپ کو کہیں گم کر دیا تھا۔ اُس کا وجود حقیقت کی بجائے ایک التباس بن گیا اور جس میں زندگی کی حقیقی تصویر کچھ دھندلا سی گئی ہے۔ حیاتِ نو کا یہ التباس ایک مقامی باشندے کے کربِ ذات کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ جس میں اُس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں؛ نہ اُس کی کوئی پہچان ہے اور نہ ہی کوئی واضح شناخت۔ کسی چیز پر اُس کی قدرت نہیں۔ اُسے اِن چیزوں سے ماورا قرار دے دیا گیا ہے۔ راشد کی نظم "خواب کی بستی" بیگانگی کے تاثرات سے مزین ہے، اس نظم میں بیگانگی کا کرب بدرجہ اتم موجود ہے:

مرے محبوب جانے دے، مجھے اس پار جانے دے
اکیلا جاؤں گا اور تیر کی مانند جاؤں گا
میں تنہا ہی جاؤں اور تنہا ہی تکلیفیں اٹھاؤں گا

مجھے جانے دے اب رہنے دے میری جان جاتی ہے

بس اب جانے بھی دو اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو　　(کلیاتِ راشد، ص۲۶)

اس نظم میں بیگانگی کی یہ کیفیت ملاحظہ کریں کہ وہ محبوب سے اجازت طلب کر رہا ہے اور اس مطالبے میں وہ بیگانگی کا کرب بھی مسلسل اٹھا رہا ہے۔

نظم کا مرکزی کردار تہذیب کے زوال کا نوحہ گر ہے اور خود اس زوال کا شکار بھی۔ وہ ایک ایسی خواہش کا اظہار کر رہا ہے جو اسے سکون و راحت میسر کر سکے۔ کیوں کہ وہ اپنے معاشرے اور ارد گرد کے ماحول سے غیر مطمئن ہے اور بعض حدود و قیود سے آزادی کا طالب ہے۔ یہ فرار اور آزادی اُسے ایک ایسی عورت کے قرب میں نظر آتی ہے جو اس کے دکھ اور درد کو سمجھ سکے۔ جو یہ جان سکے کہ اُس کا عاشق زندگی سے بھاگ کر رقص گاہ کے چور دروازے سے اُس کے پاس آیا ہے۔ یہ کردار چوں کہ اپنے معاشرے اور معاشرتی جبر سے بھاگ کر آیا ہے اس لیے اُسے کچھ دیر کے لیے راحت مل سکے۔ اگرچہ یہ راحت اور سکون چاہے کسی رقاصہ کے قرب کا مرہون ہی کیوں نہ ہو۔ راشد نے کمال مہارت سے اس شخص کی ذہنی حالت اور نفسیات کا تجزیہ کر دیا ہے۔

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے

زندگی سے بھاگ کے آیا ہوں میں

ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو

رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی

ڈھونڈ لے مجھ کو، نشاں پالے مرا

اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے

زندگی میرے لیے

ایک خونیں بھیڑیے سے کم نہیں؛(کلیاتِ راشد، ص۱۰۱،۱۰۰)

راشد کو اس زندگی میں کوئی پناہ نہیں مل پاتی تو وہ اس سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ فرار دراصل بیگانگی کی انتہائی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے جس کی بدولت اُس کی زندگی میں ایک سراسیمگی ہے۔ وہ اپنی ہم رقص کے بازوؤں میں اپنے آپ کو حوالے کرنا چاہتا ہے۔ زندگی سے فراریت اور ہم رقص سے قربت نظم کے متن کو کھولنے

میں مزید معاون ثابت ہوتی ہے۔ زندگی شاعر کے تعاقب میں ہے۔ رقص گاہ کے چور دروازے سے زندگی نے اُس کا نشان ڈھونڈ لیا ہے۔ رقص گاہ میں آکر شاعر اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا ہے کیوں کہ یہاں اُسے پناہ میں لینے کے لیے اُس کی ہم رقص تیار ہے۔ زندگی کو "خونیں بھیڑیا" قرار دینا زندگی سے انتہائی بیزاری اور بیگانگی کی کیفیت کے باعث ہوا ہے۔ زندگی نے اُسے اپنے وجود سے شاعر کو اس قدر خوف زدہ کر دیا ہے کہ اُس کے لیے زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی اور نہ ہی ایسی رعنائی جس کے سہارے وہ مزید زندگی کے قریب جا سکے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ راشد جیسے شاعر نے زندگی کی معنویت کو بالکل ہی تبدیل کر دیا۔ اُس پر جب زندگی کی حقیقت کا راز منکشف ہوا تو وہ اس کا مزید سامنا نہ کر سکا۔ کسی چیز کا سامنا نہ کرنا اور اس سے گریز پائی کا رویہ اختیار کرنا ایک مشکل امر ہے۔ یہ کیفیت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ہر چیز سے بے گانہ اور بے نیاز ہو جائے اور زندگی سے ایسی بیگانگی دراصل کسی حد تک دنیا کی بے ثباتی سے عبارت ہے۔

نو آبادیاتی جبر میں مقامی باشندے پر بیگانگی کے متنوع اثرات مرتسم ہوتے ہیں۔ بالخصوص ایک ایسے دور میں کہ جب ہر سمت استحصال، خوف، لایعنیت، غلامی، زندگی سے بیزاری اور مایوسی کے گہرے بادل چھائے ہوں اور امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی ہو، اس صورتِ حال میں ایک کم وسیلہ یا بدحال شخص کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ "ایران میں اجنبی" کی بیشتر نظمیں انہی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر نظم "پہلی کرن" میں تاریخی جبر کا ایک پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ انسانی غلامی کے جذبات کی عکاسی بھی دکھائی دیتی ہے۔ شاعر ایسی گپھاؤں سے باہر نکلنے کے جتن کرتا ہے:

کوئی مجھ کو دورِ زماں سے نکلنے کی صورت بتا دو
کوئی یہ سجھا دو کہ حاصل ہے کیا ہستی رائیگاں سے
کہ غیروں کی تہذیب کی استواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی
میں اس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے، نانِ شبینہ نہیں ہے
(کلیاتِ راشد، ص ۱۳۰)

راشد کے ہاں بیگانگی اور اجنبیت کا احساس اس وقت دوچند ہو جاتا ہے جب وہ اپنی ہی زمین پر نو آبادیاتی تسلط کو کمزور دیکھنا چاہتا جبکہ وہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ اپنی نظم "سومنات" میں پکار اٹھتا ہے:

کبھی تو دہشت زدہ نگاہوں سے
اور کبھی یاسِ جانگزا سے
غریب و افسردہ دل مسلماں
جو سوچتے ہیں
کہ اے خدا
آج اپنے آبا کی زمیں میں
ہم اجنبی ہیں
ہدف ہیں نفرت کے ناوک تیز و جانستاں کے　　(کلیاتِ راشد، ص ۱۴۷، ۱۴۸)

راشد نے نظم "طلسمِ ازل" میں بیگانگی کی کیفیت کو یک سر مختلف انداز سے دیکھا ہے۔ اس میں نو آبادیاتی عہد میں ایک مقامی باشندے کی تنہائی اور پریشان خیالی زیر سطح موجزن ہے۔ اسی وجہ سے اس کی گونج یا چیخ بلند ہوتی نظر نہیں آتی۔ نظم کا کردار رنگ و نور کی محفل میں بھی خود کو تنہا اور بیگانہ محسوس کر رہا ہے۔

میں اس شہر میں
جہاں کوئے و برزن میں بکھرے ہوئے
حسن و رقص و مئے، نور و نغمہ
نوعِ انساں کا دل، کان، آنکھیں
سب آوارۂ جستجو ہیں　　(کلیاتِ راشد، ص ۱۶۵)

راشد نے "ماورا" کی آخری دور کی نظموں مثلاً "دریچے کے قریب"، "رقص"، "بے کراں رات کے سناٹے میں"، "شرابی"، "انتقام" اور "اجنبی عورت" میں جس طرح نو آبادیاتی استبداد کا تذکرہ کیا تھا یا اُس کے جن اثرات کی نشان دہی کی تھی (ایران میں اجنبی) میں اُسی صورتِ حال کو ہندوستان سے نکال کر پورے مشرق تک وسعت دی گئی ہے۔ اس حوالے سے "ایران میں اجنبی" کو "ماورا" کے آخری دور کی توسیع بھی کہا جا سکتا ہے جس

میں شاعر کے تخلیقی تجربے کی پختگی، گذشتہ تجربات کی جانچ پرکھ، نظر کی وسعت اور دنیا کو ایک بدلی ہوئی شکل میں دیکھنے کا احساس خاصا قوی ہے۔ انفعالیت کی جگہ مشرقی افق پر فعالی کیفیات کا ظہور بھی نظر آنے لگتا ہے۔[۷]

راشد دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء۔۱۹۴۵ء) کے دوران تہران (ایران) میں استعماری افواج کا حصہ بن کر ایک ایشیائی اور ہندوستانی سپاہی کی حیثیت سے دو سال (۱۹۴۴ء۔۱۹۴۶ء) مقیم رہے۔ اس دوران میں راشد نے ایران میں دوسری عالمی جنگ کے اثرات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ ہم سب ایشیائی تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے ایک ہی زنجیر سے بندھے ہیں اور وہ زنجیر فرنگی کی "رہزنی" نے پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ ہمارا اصل رشتہ اپنے آلام کا اشتراک ہونا چاہیے تاکہ مل کر ان آلام سے نجات پا سکیں۔[۸] اِن آلام کی بدولت وہ افسردگی، مہاجرت، بیگانگی اور اجنبیت کے کرب سے گزرے۔ اس کا اظہار اُن کی متعدد نظموں میں ہوا ہے۔ ایک نظم "من و سلویٰ" میں شاعر کی کیفیت ملاحظہ کی جا سکتی ہے کہ وہ ناچار ہو کر اس جنگ سے وابستہ ہوئے ہیں:

یہ شہر اپنا وطن نہیں ہے
مگر فرنگی کی رہزنی نے
اسی سے ناچار ہم کو وابستہ کر دیا ہے　　　(کلیاتِ راشد، ص۱۸۸)

اسی نظم کے ایک حصے میں راشد نے بتایا ہے کہ نو آبادکاروں نے نو آبادیاتی باشندوں کو مزید بیگانگی کا شکار کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے ہیں۔ یہ راشد کا تاریخی شعور ہی ہے جو انھیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ انگریز راہزن ہیں جنھوں نے ہندوستان کے وسائل پر شب خون مارا اور اس کے تموّل کو عسرت میں بدل ڈالا اور جس کی بدولت وہ خود متموّل ہو گئے۔ ان کی یہ چیرہ دستیاں ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ پورے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر من چاہے اقدامات کیے۔ اس تناظر کو پیش نظر رکھ کر دیکھیں تو اس دوران محسوس ہوتا ہے کہ مقامی باشندے کی بیگانگی فزوں تر ہوئی اور اس کی اجنبیت اور تنہائی میں بے طرح اضافہ ہوا۔

وہ راہزن (انگریز) یہ سوچتا ہے
کہ ایشیا ہے کوئی عقیم و امیر بیوہ
جو اپنی دولت کی بے پناہی سے مبتلا اک فشار میں ہے
اور اس کا آغوشِ آرزومند و امرے انتظار میں ہے
اور ایشیائی

قدیم خواجہ سراؤں کی ایک نژادِ کاہل

اجل کی راہوں پہ تیز گامی سے جارہے ہیں (کلیاتِ راشد، ص۱۸۹،۱۸۸)

نو آبادکار مقامی باشندے کو اُس کے ماضی سے بیگانہ کرنے کے لیے حتی المقدور کوشش کرتا ہے اوراس میں اُسے کسی حد تک کامیابی بھی ملتی ہے۔ عام طور پر اُس کا یہ موقف ہوتا ہے کہ ایشیائی باشندے ابھی تک اپنے مجہول ماضی میں کھوئے ہوئے ہیں، جب کہ دنیا ترقی کے منازل طے کرکے کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اُن کا یہ دعویٰ ایک استعماری سوچ کی عکاسی ہے تاکہ انھیں مزید مرعوب کیا جاسکے۔ نو آبادکاروں کے حوالے سے راشد کے ہاں جو دو جذبی کیفیت نظر آتی ہے اُس کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ اہلِ مشرق جب تک اپنے ماضی سے جڑے رہیں گے وہ ایک مخصوص غنودگی کی حالت میں رہیں گے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر طارق ہاشمی کہتے ہیں:

"تخلیقی روئیدگی کے عمل میں رکاوٹ کا ایک سبب اہلِ مشرق کا ماضی میں کھویا رہنا بھی ہے۔ راشد کے نزدیک عظمتِ رفتہ کے خواب دراصل ایک نشہ یا غنودگی ہیں جو حقیقت کا ادراک نہیں کرنے دیتے ہیں۔"(۹)

راشد نے اپنی ایک نظم "کیمیاگر" میں بھی اُس نو آبادیاتی حربے کی طرف اشارے کیے ہیں جو وہ کسی بھی خطے پر قبضہ کرنے کے بعد استعمال کرتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہ بیگانہ ہو جاتا ہے۔ نو آبادکاروں کا یہ حربہ اس لیے بھی مقامی آدمی پر برتا جاتا ہے تاکہ کہیں حبِ وطن کا جذبہ بیدار نہ ہو جائے۔ "وطن ! اے وطن" کی صدائیں اس وقت دم توڑ دیتی ہیں جب یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ وطن تو اب کسی "غیر" کے زیر تسلط ہے۔ یہ استبداد کا ایسا لامختتم سلسلہ جو مقامی باشندے کو اس کے اپنے وطن سے بیگانہ کر دیتا ہے۔

وطن کے پجاری

بآہنگِ سنتور و تار و دف و نَے

لگاتے ہیں مل کر

"وطن !اے وطن !" کی صدائیں!

مگر کون جانے یہ کس کا وطن ہے؟ (کلیاتِ راشد، ص۲۰۹)

راشد کے ہاں خواب دیکھنے اور اُن کی تعبیر کے حوالے سے جو نظریات اور خیالات اُن کی تخلیقی کائنات میں نظر آتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے منفرد ہیں۔ انھوں نے "ایران میں اجنبی" میں اپنے خوابوں کو ایشیا کے تناظر

میں دیکھا ہے۔ وہ ایشیا کی دگرگوں اور ناگفتہ بہ حالت پر کڑھتے ہیں اور ایک سچے تخلیق کار کی طرح خواب دیکھتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں ان خوابوں کی تعبیر سچی ثابت ہو اور ایشیا اپنے حق کا ترجمان خود بن جائے اور اسے دنیا میں اعزاز و اکرام اور اہمیت و فضیلت نصیب ہو جائے۔ "لا=انسان" میں راشد کے خوابوں کا مطمح نظر صرف ایشیا تک محدود نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ راشد کی نظم "میرے بھی ہیں کچھ خواب" اسی تناظر کی صورت گری کرتی ہے۔ اس نظم کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ عہدِ جدید کا بیگانہ انسان کس طرح کے خواب دیکھنے کا متمنی ہے:

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب!
اس دور سے، اس دور کے سوکھے ہوئے دریاؤں سے
پھیلے ہوئے صحراؤں سے، اور شہروں کے ویرانوں سے
ویرانہ گروں سے میں حزیں اور اُداس!
اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب! (کلیاتِ راشد، ص ۲۸۷)

اس نظم کا متن گہرے مطالعے اور مشاہدے کا متقاضی ہے۔ یہاں راشد نے ایک تو خواب دیکھنے کی طرف اشارے کیے ہیں؛ دوسرا نئے خوابوں کی سمت نمائی بھی کی ہے۔ یہ نئے خواب آزادیِ کامل کے خواب ہیں۔ حقیقی معنوں میں آزادی وہی ہوتی ہے جو مکمل ہو۔ کیوں کہ ادھوری آزادی ایک نئی غلامی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے اور ادھوری آزادی میں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نو آزاد باشندہ ایک بار پھر غلامی کی اتھاہ گہرائی میں چلا جائے۔ جب خواب پرانے ہو جائیں اور اُن کی کوئی خاطر خواہ تعبیر نہ ہو یا تعبیر ادھوری ہو تو پھر دوبارہ نئے سرے سے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ ایک نئی اُمنگ اور نئے ڈھنگ کے ساتھ اور پہلے کی نسبت زیادہ منظم انداز سے! یہ "نیا خواب" نئے انسان کا نصب العین بھی ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں نیا انسان منتشر خیالی اور الجھن کا شکار رہتا ہے۔ وہ اس امید پہ زندگی گزارتا ہے تاکہ اُس کی تمام الجھنیں اور مسائل ختم ہو جائیں۔ اس تیقن کے ساتھ وہ خواب در خواب دیکھتا ہے۔ اپنے وطن کی آزادی کے اور اپنی خوش حالی کے!

درج بالا نظم کے بارے میں راشد؛ ڈاکٹر آفتاب احمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وہ نظم جس کی پاکستان میں بسم اللہ ہوئی تھی؛ خدا خدا کر کے مکمل ہو گئی۔ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ امید نہیں ٹائپ میں نظم کا پڑھنا تمھارے لے ے کچھ مشکل ہو گا۔ دوسرے صفحے پر کچھ ایشیائیوں، کچھ فرنگیوں اور کچھ روسیوں کی طرف اشارے ہیں جن کے "خوابوں" سے الگ خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔"(۱۰)

اس نظم میں راشد کے خواب آفاقی حیثیت حاصل کر گئے ہیں۔ یہاں ان کے خیالات میں دنیا کے محکوم، مجبور اور مقہور انسانوں کی ترجمانی ملتی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں کہا گیا کہ اس مجموعے میں راشد کا اہم ترین موضوع انسان ہے، اور یہ انسان ہندوستانی یا ایشیائی نہیں بلکہ عالمی ہے۔ نو آبادیاتی طاقتیں دنیا کے کسی انسان پر ظلم کرتی ہیں تو راشد جیسے شاعر کی انسان دوستی ایک قابل تقلید مثال ہمارے سامنے نظر آتی ہے۔ فتح محمد ملک نے مغربی سامراج کی حکمت عملیاں واضح کرتے ہوئے کہا ہے:

"مغربی سامراج پاکستان، دنیائے اسلام اور ایشیا میں خوابوں (انقلابی آرزومندی) کے قتل عام کی اسی حکمتِ عملی پر عمل پیرا چلا آ رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دنیائے انسانیت کا یہ خطہ زمین پر خوابوں کی موت کا یہ منظر ن م راشد کے لے ے ہمیشہ سوہانِ روح بنا رہا اور وہ عمر بھر موت کے اس منظر کو زندگی بخشنے کی تمناؤں کی صورت گری میں مصروف رہے۔"(۱۱)

خواب کی کیفیت راشد کے ہاں مختلف رنگوں میں دکھائی دیتی ہے۔ مذکورہ بالا نظم کے چند لائنوں میں خوابوں کی تمنا کی گئی ہے۔ یہ تمنا نو آبادیاتی عہد میں ایک ایسے مقامی باشندے کی ہے جو نو آبادکاروں کے طفیل بیگانگی کا شکار ہو چکا ہے اور اب عشقِ ازل گیر اور ابد تاب کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے خوابوں کا تمنائی ہے۔ خواب کی یک سر مختلف کیفیت راشد کی ایک اور شہرہ آفاق نظم "اندھا کباڑی" میں دکھائی دیتی ہے۔ جس میں نابینا کباڑی خواب بیچنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

شام ہو جاتی ہے
میں پھر سے لگاتا ہوں صدا ____
"مفت لے لو مفت، یہ سونے کے خواب ____"
"مفت" سن کر اور ڈر جاتے ہیں لوگ

اور چپکے سے سرک جاتے ہیں لوگ ____ (کلیاتِ راشد، ص ۴۹۶)

نو آبادیاتی جبر کی چیرہ دستیاں تنوعات کی حامل ہوتی ہیں جو عسرت، تنگ دستی، مایوسی، تنہائی سے ہوتی ہوئی بیگانگی پر منتج ہوئی ہیں۔ مقامی باشندہ چار و ناچار مایوسی اور خوف کی خاک و خون میں غلطاں رہتا ہے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ وہ خواب بیچنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ خواب جو اُس نے روشن مستقبل کے دیکھے تھے لیکن اُن کی عملی تعبیر کی صورت نظر نہیں آئی تو مجبوراً وہ اپنے خوابوں کو سر بازار لے آیا ہے۔ یہ مایوسی اور تنہائی کی انتہائی کیفیت ہے جو بیگانگی کی بدولت مزاج میں در آئی ہے لیکن اُس کی بد قسمتی ملاحظہ کریں کہ اُس کے خواب نہیں بک پاتے پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ بے دام اپنے خواب بیچنے پر بھی راضی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں نہیں رکتا اور پھر بالآخر وہ ان خوابوں کے ساتھ اُن کے دام بھی دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

"یہ لے لو خواب ____"
اور لے لو مجھ سے اِن کے دام بھی
خواب لے لو، خواب ____
میرے خواب ____
خواب ____ میرے خواب ____
خوااااب ____
اِن کے داااام بھی ی ی ی ____" (کلیاتِ راشد، ص ۴۹۸)

راشد کے مجموعے "لا = انسان" میں انسان کی بیگانگی، کربِ ذات اور زندگی کی لایعنیت کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ یہ نظمیں مشرق سے نکل کر پوری دنیا کے انسان کی صورت حال کو تخلیقی رنگ میں پیش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے بقول:

"ان نظموں میں زندگی اور وجود کی لاحاصلی اور بے معنویت کا شدید کرب اور انکشافِ ذات کی منزلوں تک پہنچنے کی وہ سعی ملتی ہے جو آج پوری دنیا کی جدید شاعری کا نقطۂ ارتکاز ہے۔ راشد کا ہنر یہ ہے کہ انھوں نے اس کرب اور المیے کو محسوسات کی سطح پر بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے اور فکر کی سطح پر بھی۔ اس طور پر وہ اپنے مخصوص

شعری کردار کو برقرار رکھتے ہوئے اردو شاعری کے جدید ترین میلانات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔"(۱۲)

"لا=انسان" میں "ریگِ دیروز"، "دل، مرے صحرا نوردِ پیر دل"، آئینہ حِس و خبر سے عاری"، "بوئے آدم زاد"، "گداگر"، "تمنا کے تار"، "ہم کہ عشاق نہیں...."، "زمانہ خدا ہے"، "بے صدا صبح پلٹ آئی ہے"، "وہی کشفِ ذات کی آرزو"، "اس پیڑ پہ ہے بوم کا سایہ" اور اس جیسی دیگر نظموں میں راشد نے انسان کی اقدار، زمانے کی کشاکش، کربِ ذات اور تہذیبی تصادم کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔

"لا=انسان" کا اہم ترین موضوع انسان ہے۔ نو آبادیاتی نظام نے ایک ایسا انسان "تیار" کیا جو نہ صرف جغرافیائی سطح پر غلام تھا بلکہ فکری سطح پر بھی غلامی ہی اُس کا مقدر تھی۔ "ماورا" میں راشد نے ایسے سفر کا آغاز کیا تھا جس میں ایک نو آبادیاتی باشندے کا کرب اور اس کی گھمبیرتا تھی، جس میں بغاوت نے کئی دروازے کھولے تھے۔ "لا=انسان" تک آتے آتے راشد کے مزاج میں کئی تغیرات در آئے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

> "راشد نے "ماورا" میں ایک ایسے بسورتے اور کراہتے ہوئے فرد کو پیش کیا تھا جس کی برہمی کی آخری حد بغاوت اور توڑ پھوڑ سے آگے نہیں تھی جب کہ "لا=انسان" تک آتے آتے اُن کے فرد کی برہمی نے ایک مثبت لگن اور تڑپ کی صورت اختیار کر لی ہے اور جذبے کی گراں باری، احساس کی جراحت میں تبدیل ہو کر اُن کے کلام میں ایک بلند تر سطح کا باعث بن گئی ہے۔"(۱۳)

"حسن کوزہ گر" راشد کی پوری شاعری کی کلیدی نظم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ راشد کے کلیات سے اگر "حسن کوزہ گر" نکال دی جائے تو ادھورا پن رہ جائے گا۔ وہ راشد جو اس نظم میں ہمیں نظر آتا ہے وہ کسی اور نظم میں مفقود ہے۔ اس نظم کا اختصاص یہ ہے کہ اسے راشد کی نظم نگاری میں وہ مقام حاصل ہے جو اقبال کی اردو شاعری میں "مسجدِ قرطبہ" کو حاصل ہے۔ اس نظم کے بنیادی موضوعات ہیں: عشق بلاخیز، تخلیق اور تخلیقی عمل۔ یہ نظم چار حصوں پر مشتمل ہے اور چاروں حصے باہم مربوط ہو کر ایک مختلف شعری فضا خلق کرتے ہیں۔ یہ نظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک داستان بھی ہے۔

نظم کا مرکزی کردار "حسن" نو آبادیاتی نظام کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہے جو ایک طرف تو محبت کے حصار میں محصور ہے تو دوسری طرف "غیر" کے استبدادی اور بیگانگی کے حامل نظام نے اُس سے زندگی کی رعنائی چھین لی ہے اور اب وہ محبت کے لیے دن رات سرگرداں ہے:

جہاں زاد، نیچے گلی میں ترے دَر کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں کی وہ تابناکی
تھی مَیں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
جہاں زاد، نو سال دیوانہ وار پھرتا رہا ہوں! (کلیاتِ راشد، ص ۲۵۳)

نو آبادیاتی بیگانگی نے مقامی باشندے کی زندگی کو "بیمار کی رات" بنا دیا ہے۔ وہ عمر بھر حیاتِ نو کے خواب دیکھتا اور اُس کی تعبیر میں صرف کر دیتا ہے۔ راشد نے اس مجموعے کی بیشتر نظموں میں زندگی کو مختلف پیکر میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ "زندگی اک پیرہ زن" میں زندگی کو ایک ایسی بوڑھی عورت کے روپ میں دکھایا ہے جو مفلوک الحال ہے، جو سارا دن گلی کوچوں میں پرانی دھجیاں جمع کرتی رہتی ہے۔ راشد کے موئے قلم نے اس بڑھیا کی زندگی کے مختلف گوشے دکھائے ہیں۔ یہ بڑھیا بیگانگی کا شکار اور اپنے حال سے پریشان ہو کر جب اپنے ماضی کی سمت دیکھتی ہے تو وہاں بھی اُسے سوائے مایوسی کے کچھ نہیں مل سکتا۔ راشد نے یہاں "ماضی کا کنواں" کہہ کر دراصل ماضی پرستی کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ راشد کی مندرجہ نظم کے متن کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ راشد کا تصورِ ماضی کس نوعیت کا ہے اور زندگی کو کس تناظر میں دیکھا ہے:

____ اب ہوا سے ہار تھک کر جھک گئی ہے پیرہ زن
جھک گئی ہے پاؤں پر، جیسے دفینہ ہو وہاں!
زندگی، تو اپنے ماضی کے کنویں میں جھانک کر کیا پائے گی؟
اس پرانے اور زہریلی ہواؤں سے بھرے، سُونے کنویں میں
جھانک کر اس کی خبر کیا لائے گی؟

ـــــــ اس کی تہہ میں سنگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں

جُز صدا کچھ بھی نہیں!		(کلیاتِ راشد، ص ۳۰۰)

مرد اساس معاشرے میں عورت کو کمزور "مخلوق" ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ اس معاشرے میں اُسے کبھی مرکزی حیثیت نہیں مل سکی۔ اس نظم میں بھی ایک بوڑھی عورت ہی کو منتخب کیا گیا ہے جو گلیوں میں دھجیاں جمع کرتی پھرتی ہے۔ جو مفلوک الحال ہے، جس کے بال بکھرے ہوئے، دانت اور پیرہن میلے ہیں۔

اس نظم کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا کہنا ہے:

> "عورت کو سماج نے بالعموم اپنے حاشیے پر جگہ دی ہے ۔ عورت کے ساتھ، مرد معاشرے نے وہی سلوک کیا ہے جو مقتدر قوتوں نے محکوموں، غلاموں اور منحرفین کے ساتھ روا رکھا۔ عورت کی کم زوری اور نسوانیت کے بیش تر تصورات سماجی تشکیلات ہیں۔ یعنی وہ عورت کی فطرت کے عکس ریز ہونے کے بجائے سماج کی مرکزی قوتوں کی ترجیحات کے زائیدہ ہیں۔ دھجیاں جمع کرنا دراصل وہ معمولی اور ادنیٰ افعال ہیں، جن کی ادائی پر عورت کو مجبور رکھا گیا ہے تا کہ اسے شعورِ ذات حاصل نہ ہو۔"[۱۴]

راشد نے ملازمت کے سلسلے میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان سے باہر گزارا۔ وہ تیسری دنیا کے مسائل سے بخوبی واقف تھے کہ انھوں نے کھلی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ تیسری دنیا کے پس ماندہ، مقہور، مجبور اور محکوم ممالک جو برطانوی یا مغربی استعماریت کا شکار اور کافی طویل عرصہ زیرِ نگیں رہے، وہ اس حد تک مغربی فکر کے زیرِ اثر رہے کہ ان ممالک نے اپنے ہی ماضی کا مطالعہ طاقت اور اقتدار کے تابع رہ کر کیا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ ان محکوم ممالک میں اپنے ہی ماضی اور حال کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھنے کے کیسے کیسے رویے سامنے آئے۔ یہ نو آبادکاروں کے تسلط اور سیاسی اجارہ داری کے اثرات تھے جن کی وجہ سے محکوم ممالک اپنی ہی تاریخ سے یک سر اجنبی بنتے چلے گئے۔ بدیسی آقاؤں نے بہ ہر حال اپنے آپ کو سفید فام کہہ کر افضل واعلیٰ اور برتر قرار دیا جبکہ مقامی باشندوں کو سیاہ فام کہہ کر انھیں طنز و تضحیک اور استہزا کا نشانہ بنایا گیا۔ نو آبادیاتی نظام میں نو آبادکار مقامی باشندے پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے استبدادی حربے استعمال کرتا ہے۔ یہ حربے اُس باشندے کی ذات کی نفی اور اپنے وجود کی اجارہ داری ہے۔

فرانز فینن کا کہنا ہے:

"۔۔۔ استعمار دوسرے شخص کی منظم نفی ہے اور چوں کہ وہ خوفناک ارادے کے ساتھ کسی دوسرے شخص پر انسانیت کے تمام خواص کو حرام کر دیتا ہے، لہٰذا وہ مقبوضہ عوام کو خود سے یہ سوال دہراتے رہنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ "در حقیقت" میں کون ہوں؟"(۱۵)

فرانز فینن کی مذکورہ بالا رائے بنیادی طور پر نو آبادیاتی جبر کی بھرپور عکاسی کرتی ہے کہ جب مقامی باشندہ بیگانگی کا شکار ہوتا ہے تو درحقیقت اس کے پیچھے دیگر وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بے شناخت ہو کر رہ جاتا ہے اور بعض یہ بے شناخت اور بے چہرگی اُسے اجنبی بنا دیتی ہے۔ یہ کیفیت ایک بے مہری کو جنم دیتی ہے جس کی طرف راشد نے بھی اشارے دے ے ہیں:

بے مہری، بے گانہ پن کے تابستانوں میں
ہر سو منڈلانے لگتے ہیں زنبورِ اوہام
اور ساتھ اپنے اک ابدیت لاتے ہیں
شہروں پر خلوت کی شب چھا جاتی ہے
غم کی صرصر تھراتی ہے ویرانی میں
اونچے طاقت ور پیڑوں کے گرنے کی آوازیں آتی ہیں میدانوں میں (کلیاتِ راشد، ص ۳۴۹)

بیگانگی کے حوالے سے "گماں کا ممکن" میں راشد کے فکر و فن کا ایک اور جہان آباد ہے جس میں انسان کی کربِ ذات، تنہائی، اجنبیت بھی ہے اور آشوبِ کائنات بھی! اس مجموعے میں بھی خوابوں کی بُنت کاری دکھائی گئی ہے۔ نو آبادیاتی نظام نے فرد کو جس طرح تنہائی کا شکار کیا اور اُس کے خوابوں کی تعبیر کو جس طرح اُلٹا؛ یہ ایک دردناک داستان ہے۔ راشد جیسے خلاقی ذہن نے اس تناظر کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کر دی ہے۔ یہ صورتِ حال جتنی بھیانک ہے اُتنی ہی اذیت ناک بھی۔

جدیدیت کا بنیادی منطقہ انسان دوستی سے تشکیل پاتا ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں نو آبادیاتی نظام میں جب جدیدیت انتہا پسندی کا شکار ہوئی تو فرد کی تنہائی موضوعِ بحث بنی۔ جب فرد تنہائی کا شکار ہوتا ہے تو اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ مایوسی اور ناامیدی کے سبب مقامی باشندے کے پاس صرف خیال ہی خیال رہ جاتا ہے اُس کے لفظ کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ لفظوں کی گم شدگی سے شناخت کا بحران پیدا ہوتا ہے جو نو آبادیاتی نظام کا کامیاب حربہ ہے۔

جب کسی معاشرے میں افراد؛ فرد فرد ہو جائیں تو پھر وہ معاشرہ یک جا نہیں بلکہ کئی اکائیوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ تنہائی کی یہ انتہائی شکل عدمیت پر منتج ہوتی ہے جسے موت بھی کہا جاتا ہے۔

بیگانگی، تشکیک اور فرد کی تنہائی نو آبادیاتی نظام کی وہ صورتیں ہیں جس میں انسان کا جسم اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اور خیال ایک گمان بن کر رہ جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت فرد پہلے گمان بنتا ہے اور بعد ازاں اس گمان کا صرف امکان رہ جاتا ہے۔ راشد نے دریافت کیا کہ فرد جو گمان اور خیال بن کر رہ گیا اس کے وجود کو تلاشا جائے۔ اس مجموعے میں "آگ کے پاس"، "یہ خلا پُر نہ ہوا"، "طلب کے تلے"، "جہاں ابھی رات ہے"، "اے سمندر"، "حسن کوزہ گر (حصہ دوم، سوم، چہارم)، "سمندر کی تہہ میں"، "مریل گدھے"، "مجھے وداع کر"، "آگی ہے ریت" اور "اندھا کباڑی" وغیرہ جیسی اہم نظمیں شامل ہیں۔ جن میں راشد کا استعاراتی، تلمیحاتی اور لفظیاتی نظام معنیات کے نئے در کھولتا ہے۔ اس کے علاوہ نو آبادیاتی نظام کی وجہ سے ایک مقامی باشندے کی بے سمت زندگی اور انتشارِ ذات کی وجہ سے اس کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے راشد نے سیدھے سبھاؤ انداز میں بیان کر دیا ہے۔

اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ نو آبادیاتی عہد میں مقامی باشندہ شدید ترین بیگانگی کا شکار رہا اور بادلِ نخواستہ اُسے بے شناخت ہو کر اجنبی رہنا پڑا۔ یہ بیگانگی سماجی اور سیاسی ہر دو طرح کی تھی۔ راشد نے اپنے نظموں میں نو آبادیاتی بیگانگی کو جس طرح موضوعِ بحث بنایا اس کی مثالیں اُن کے معاصرین میں کم کم ہی ملتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ناصر عباس نیر، Coloniality, Modernity and Urdu Literature، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ص۱۹

۲۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ و عمل، (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۴ء)، ص۲۰۶،۲۰۷

۳۔ سعادت سعید، راشد اور ثقافتی مغائرت، (لاہور: شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء)، ص۵

۴۔ ایضاً، ص۶،۵

۵۔ ن۔م۔راشد، لا=انسان، (لاہور: المثال، ۱۹۶۹ء)، ص۵

۶۔ شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص۱۰۷

۷۔ تبسم کاشمیری، لا=راشد، (لاہور، نگارشات، ۱۹۹۴ء)

۸۔ ن۔م۔راشد، لا=انسان، (لاہور: المثال، ۱۹۶۹ء)، ص۱۷

۹۔ طارق ہاشمی، اردو نظم اور معاصر انسان، (اسلام آباد:، پورب اکادمی، فروری ۲۰۱۵ء)، ص ۵۶
۱۰۔ آفتاب احمد، بیادِ صحبت نازک خیالاں، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۰۲، ۲۰۳
۱۱۔ فتح محمد ملک، ن م راشد: سیاست اور شاعری، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۹۳
۱۲۔ خلیل الرحمن اعظمی، راشد کا ذہنی ارتقا، مشمولہ: ن۔م۔ راشد: ایک مطالعہ، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، (کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۶ء)، ص ۷۸
۱۳۔ وزیر آغا، نئے مقالات، (لاہور: جمہوی پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۶۶
۱۴۔ ناصر عباس نیر، مابعد جدیدیت: اطلاقی جہات، (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۷۲
۱۵۔ فرانز فینن، اُفتادگانِ خاک، (ترجمہ: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی)، (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۲۶، ۲۲۵۔